"اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام"

از: پروفیسر بختیار حسین صدیقی

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
'محاضرات قرآنی' (منعقدہ مارچ ۱۹۹۰ء) میں پیش کیا گیا۔

تبلیغی جماعت کے ایک سرگرم کارکن میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ وہ اکثر بڑے دُکھ کے ساتھ گلہ کرتے رہتے ہیں کہ ان کی اولاد نماز نہیں پڑھتی، حالانکہ وہ خود پانچوں وقت کی نماز مسجد میں پڑھتے ہیں۔ ملک میں اور بیرونِ ملک تبلیغی گشت پر جاتے رہتے ہیں۔ ان دَوروں سے وہ مطمئن بھی نظر آتے ہیں لیکن چراغ تلے اندھیرا۔ ان کی بڑی خواہش ہے کہ ان کے بیٹے ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ بیٹا باپ کا اتباع نہیں کرے گا، تو ان کے مشن کو آگے کون بڑھائے گا؟ ایک چینی کہاوت یاد آگئی۔ جب بیٹا باپ کی بات نہ سمجھے، تو یہ خطرے کی علامت ہے۔ ہمارا معاشرہ آج اسی خطرے سے دوچار ہے۔ اور ہمیں اس کا احساس ہی نہیں۔ شاید یہ چینی کہاوت ذہن کے دریچے کھولے اور اس صورتِ حال کا ہمیں پورا پورا شعور بخشے۔

مرکزی انجمن خُدّامُ القرآن، قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج لاہور کی رُوحِ رواں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر اللہ تعالےٰ کا بڑا فضل و احسان ہے۔ ان کے بیٹوں کو باپ کا علم ازبر ہے۔ میراثِ پدر کے وہ ہر طرح اہل ہیں۔ انشاء اللہ دعوت رجوع الی القرآن میں وہ سب اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔ اس سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے احیائے اسلام کا جو کام شروع کیا ہے اور جس انداز سے شروع کیا ہے، اللہ تعالےٰ کو وہ پسند ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ کام نسل در نسل جاری رہے۔ ڈاکٹر عارف رشید ایم بی بی ایس، حافظ عاکف سعید ایم۔اے فلسفہ، حافظ عاطف وحید ایم ایس سی اقتصادیات، ماشاء اللہ سب کے سب ان کی تحریک تعلّم و تعلیمِ قرآن سے ہمہ وقت و ہمہ تن وابستہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے کہ وہ سب کو اور بالخصوص دین کا کام کرنے والوں کو ایسی سعید و وحید اولاد عطا فرمائے آمین۔

اب آیئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی فکر انگیز تحریر "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام" کی طرف جو ان کی کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" کے خلاصے اور مرکزی انجمن خدام القرآن، قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج لاہور کے منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن رہنما اصولوں کو ڈاکٹر صاحب نے اس تحریر میں اپنی تحریک کی اساس قرار دیا ہے، ان میں کوئی اضافہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ایک کم نظر اور کم سواد سے اس کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے۔ میں صرف ان کی پُرزور تائید و توثیق ہی کر سکتا ہوں۔ کوئی منشور جس حد تک جامع ہو سکتا ہے، وہ جامعیت اس میں قطعی موجود ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے دریا کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس میں بند چند ایک اصولوں کو میں دریا کے تناظر میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور بس۔ دریا سے یہاں مراد جدید علوم کا فروغ اور ان کی روزافزوں ترقی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریک چونکہ ایک "علمی تحریک" ہے اور ان کا تخاطب معاشرے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور طباع افراد سے ہے، اس لیے ان کی تقلید میں میری بھی یہ کوشش ہو گی کہ خالص علمی اعتبار سے ان کی تحریک کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالوں۔

(۱) علم اور ثقافت

علم ثقافت کی جڑ ہے اور ثقافت علم کا ثمر۔ جیسا علم، ویسی ثقافت۔ علم جس حد تک معروضی اور جامع ہوگا، اسی حد تک ثقافت جامع اور ہمہ گیر ہو گی۔ اس کی عظمت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ کس قسم کے افراد پیدا کرتی ہے اور کس قسم کے معاشرے کو جنم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تحصیلِ علم پر بے انتہا زور دیا۔ علم میں زیادتی کی دعا مانگنے کا حکم دیا۔ ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم کی جستجو فرض کر دی۔ مہد سے لحد تک علم حاصل کرو، خواہ تمہیں اس کی خاطر چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

تاریخی اعتبار سے علم کی جستجو تین مراحل سے ہو کر گزری ہے۔ فرانسیسی مفکر آگست کونت (م۔ ۱۸۵۷) نے انہیں دینیاتی منزل، مابعد الطبعیاتی منزل اور سائنسی منزل کے نام دیئے ہیں۔ زمانہ قدیم کی ثقافت پر مذہبی تخیل کی چھاپ تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کی ثقافت پر مجرد تصورات غالب تھے۔ دورِ جدید کی ثقافت پر ٹھوس حقائق کا قبضہ ہے۔ یہ سائنس اور ٹیکنولوجی کا دور ہے۔ یہ تسخیر قمر کی صدی ہے۔ یہ کمپیوٹر اور روبوٹ کا عہد ہے۔ سائنس کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہے۔ جو چیز نظر آتے

وہ ہے۔ جو نظر نہ آئے، وہ نہیں ہے۔ مجرد تصوّرات اور روحانی واردات حتیٰ کہ خدا کے وجود کا عقیدہ بھی زمانہ قبلِ سائنس کی یادگار ہیں۔ یہ میوزیم کی زینت تو بن سکتے ہیں، زندگی کی روحِ رواں نہیں۔ سائنس حقائق کا دفتر ہے۔ ان حقائق کے کیا معنی ہیں ؟ ان کی کیا قدر و قیمت ہے ؟ ہماری زندگی کے لیے ان کی کیا اہمیت ہے ؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں۔ سائنس ہمیں حقیقت کا جزوی علم دیتی ہے، اس کا کلّی علم نہیں دیتی۔ جو قوم اپنی ثقافت کی بنیاد سائنس اور صرف سائنس پر رکھے گی، اس کی ثقافت اُدھوری اور ناقص ہوگی۔ وہ معروضی تو ہوگی لیکن جامع اور مکمل ہرگز نہیں ہوگی۔ سائنس قدرت کو مسخر کرسکتی ہے، انسان کو اپنے ماحول پر مکمل اختیار دے سکتی ہے، لیکن اپنی ذات سے اسے بیگانہ کردیتی ہے۔ روحانی طور پر اسے بے گھر کردیتی ہے اور وہ مشین کا ایک پرزہ ہوکر رہ جاتا ہے ؎

ہے دل کے لیے موت، مشینوں کی حکومت احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

سائنس کہتی ہے انسان وسیع فطرت کا ایک حِصّہ ہے، اس لیے قانونِ تعلیل کے ذریعے وہ اس کے تمام مسائل حل کرسکتی ہے۔ اور یہ بھول جاتی ہے کہ فطرت کے دُوسرے حِصّوں کے برعکس اسے بحیثیت جسم اپنی فطرت کا ایک حِصّہ ہونے کا شعور ہے۔ یہ شعور اسے فطرت کے دوسرے حِصّوں سے ممتاز کرتا ہے، اس لیے جو قانون وسیع فطرت میں جاری و ساری ہے اس کی اپنی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔ انسان کو صرف یہی شعور نہیں کہ وہ فطرت کا ایک ذی شعور حِصّہ ہے، اسے اس بات کا بھی شعور ہے کہ فطرت کا ایک حِصّہ ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اسے فطرت کا شعور ہے اور اپنی ذات کا شعور بھی اور ان دونوں اقسام کے شعور کا بھی شعور۔ یہ خود شعوری بتاتی ہے کہ زندگی ایک ماورائی قدر کی حامل ہے اور اقدار کی اقلیم وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سائنس کی سرحد ختم ہوجاتی ہے۔ مختصر یہ کہ عقل میں جب تک جذبے کی آمیزش نہ کی جائے، سائنس میں مذہب کا پیوند نہ لگایا جائے، انسان کی ثقافت ادھوری اور نامکمل رہتی ہے اور خود انسان پُورا انسان بننے کی بجائے آدھا انسان ہی رہتا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے ؎

وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

سائنس زہرہ پر بھی مون ہوٹل تعمیر کرسکتی ہے، لیکن انسان کو اس کی زندگی کے معنی

نہیں بتا سکتی۔معنی، مقصد، اہمیّت اور قدر و قیمت کے الفاظ زندگی کے ایک اعلیٰ وارفع معیار کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ الفاظ سائنس کی لغت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ آندرے مارلو نے بالکل صحیح کہا ہے کہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں مذہب سے بیگانگی کی وجہ سے جو زبردست خلا پیدا ہوا ہے، اسے پُر کیسے کیا جائے ہ ڈاکٹر اوری کا کہنا ہے کہ دنیا ایک ایسے عظیم پیغمبر کی منتظر ہے جو سائنس کے حقائق کو تسلیم کرے اور اس کے پیدا کردہ زبردست رُوحانی خلا کو پُر کرنے کے جذبے کو حرکت میں لائے۔

(۲) اسلام کا ذہنی مزاج

اب آیئے اسلام کے مزاج اور اس کی ذہنی افتاد کی طرف۔ اسلام ایک جامع اور عالمگیر مذہب ہے۔ اس کی جامعیت اور عالم گیریت کا تقاضا ہے کہ وہ ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرے، اعتدال و توازن کو اپنا شعار بنائے، افراط و تفریط کی انتہا پسندی سے گریز کرے اور ان دونوں کے درمیان صراطِ مستقیم پر چلے۔ اس کی یہ اعتدال پسندی ہی اسے زمان و مکاں کی قید سے آزاد کرتی ہے اور اسے ہر زمانے میں ایک قابلِ عمل دین کی امتیازی حیثیت دیتی ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کو امتِ وسطیٰ کا نام اسی لیے دیا ہے کہ اس کا خمیر اعتدال و توازن سے اٹھایا گیا ہے۔ انتہا پسندی اس کے مزاج کے خلاف ہے، خواہ اس کا تعلق رُوح سے ہو یا جسم سے، دین سے ہو یا دنیا سے، مذہب سے ہو یا سائنس سے، نظریۂ علم سے ہو یا نظریۂ حقیقت سے، حقائق سے ہو یا اقدار سے۔ علم وہ بنیانِ مرصوص ہے جس پر ثقافت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور یہ ثقافت جسم اور رُوح دونوں کی ضروریات کو پُورا کرتی ہے۔ علم میں ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی اور رُوحانی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ان بدلی ہوئی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے زندہ ثقافت اپنی تعمیرِ نو اور تنظیمِ نو کرتی رہتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اپنے نام لیواؤں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہے۔ یہی وہ خطرہ ہے جس کے تدارک کے لیے اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ لکھی۔ ان کے نزدیک وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں جدید سائنس کی رُوح پھونکی جائے، وہ سائنس جو خود اسلام کے بطن سے

پیدا ہوئی، جیساکہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے۔ نطشے نے دنیا کو خبردار کیا تھا کہ عیسائیت کی نسوانی اقدار کو مردانہ اقدار سے بدلو، ورنہ تباہی اس کا مقدّر ہے۔ اسلام بہ یک وقت جمالی اور جلالی دونوں اوصاف کا حامل ہے۔ اقبال کا مردِ مومن ان دونوں اوصاف سے متّصف ہے۔ کمی ہے تو صرف یہ کہ ازمنہ وسطیٰ کا علمِ کلام آج اس کی روحانی ضرورتوں کو نہیں پورا کرتا۔ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ سائنس اور ٹیکنولوجی کی اس دنیا میں زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں رہی ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی بدلی ہوئی روحانی اور مادی ضروریات کو اسلام کی مقرر کی ہوئی حدِ اعتدال کے اندر رہتے ہوئے پورا کیا جائے، ورنہ ہم اسلام کے مرکزِ ثقل سے دور ہٹ جائیں گے اور مغرب کی اندھی تقلید کا شکار ہو جائیں گے، جیساکہ ہم واقعتاً اس کا شکار ہوتے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے 'فکرِ مغرب کا ہمہ گیر استیلا' اور 'عالمِ اسلام پر مغرب کی سیاسی و فکری یورش' کے ذیلی عنوانات کے تحت اسی اندھی تقلید کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

(۳) شاعری کا چیلنج اور اسلام

قرآن کا ارشاد ہے: اللہ تعالےٰ اس وقت تک کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنے دل ودماغ میں انقلاب برپا نہ کرے۔ خیالات میں تبدیلی آتی ہے، تو معاشرہ خود بخود بدل جاتا ہے۔ دِل بدلتا ہے، تو ماحول کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ذہن میں انقلاب آتا ہے تو قیصر وکسریٰ کے محل زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ اسی تبدیلی اور انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی قوم سے ان ہی کی زبان میں، ان کی ذہنی افتاد اور استعداد کے مطابق بات کی، تاکہ وہ اس کی طرف متوجّہ ہوں اور اس کی بات پر دھیان دیں، سوچیں، غور کریں اور اپنے آپ کو بدلنے کا فیصلہ کریں۔ محمدؐ کو جس قوم کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا گیا، وہ شاعرانہ ذوق کی مالک تھی، فصاحت وبلاغت پر جان دیتی تھی، شاعری کی رسیا تھی، اس کے ہر قبیلے کا ایک اپنا شاعر تھا۔ شعر گوئی کے مقابلے عام تھے۔ ایسی قوم کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لیے قرآن شاعرانہ لب ولہجے میں نازل ہوا۔ یہ پہلا خارجی چیلنج تھا جس کا مقابلہ خود قرآن نے کیا: "ہم نے پیغمبرؐ کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے۔"

قرآن کا یہ ارشاد اٹل اور برحق ہے۔ اصل مسئلہ شاعرانہ صلاحیت کا نہیں ہے، بلکہ شاعری کا ذوق رکھنے والی عربی قوم کو قرآن کی طرف متوجہ کرنے کا ہے۔ توجّہ کے بغیر کسی بات پر دھیان نہیں دیا جاسکتا۔ دھیان دیئے بغیر نہ اسے سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ کر اس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ مقصود عربوں کے شعری ذوق سے نفسیاتی فائدہ اٹھانا تھا، اس لیے قرآن کو شاعرانہ محاسن کا اعلیٰ ترین نمونہ بننا پڑا۔

(۴) فلسفے کا چیلنج اور اسلام

شاعرانہ تخیل کا دور ختم ہوا تو فلسفیانہ تفکر نے اس کی جگہ لے لی۔ یونانی فلسفہ مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھا گیا۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کو اپنے اپنے گھروں میں فلسفے کی تعلیم دینے لگے۔ مذہبی عقائد کے عقلی جواز کا سوال پیدا ہوا اور یوں فلسفہ اسلام کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ قرآن کی شاعرانہ فصاحت و بلاغت کی مثال ہمارے سامنے تھی۔ چنانچہ اب اس کی تعلیمات کو بدلی ہوئی روحانی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے ہم نے فلسفیانہ رنگ دینے کا فیصلہ کیا اور ایک نیا علم، علم الکلام ایجاد کیا جس نے اطمینانِ قلب کے ساتھ ساتھ ذہن کی بھی تسکین کا سامان مہیا کیا۔ عباسی خلیفہ المامون نے ۸۳۰ء میں یونانی علوم کا عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے بغداد میں دارالحکمت قائم کیا اور یہودی و عیسائی علماء کو اس کام پر مامور کیا۔ یہ دارالحکمت قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کی بدولت یونانی منطق، فلسفہ، ریاضی، طبعیات، اخلاقیات اور طب اسلامی نصاب میں داخل ہوئے۔ مساجد عقلی و نقلی دونوں علوم کا مرکز بن گئیں۔ تجلیاتِ کلیم کو مشاہداتِ حکیم سے ہم کنار کرنا ہی اس دور کا عظیم کارنامہ ہے۔ مذہب و فلسفے کی اس ہم آہنگی نے فارابی، مسکویہ، ابن سینا، زکریا رازی، الخوارزمی، جابر ابن حیان، غزالی، ابن رشد اور ابن طفیل جیسے عہد آفریں نابغۂ روزگار پیدا کیے اور اسلام ازمنہ وسطیٰ میں تہذیب و تمدن کی علامت بن گیا۔ یہودیت اور عیسائیت پر بھی اس کے ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے۔ تین سو سال تک فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی کتب پیرس اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل رہیں اور ابنِ رشد تو یورپ میں ایک تحریک بن گیا جو رشدیت (Averrorism) کے نام سے موسوم ہے۔

رینان کی کتاب "رشدیت" میں اس کی تفاصیل پڑھی جا سکتی ہیں۔

(۵) ثقافتی اثر پذیری ایک انتخابی عمل ہے

ثقافت علم کا ثمر ہے۔ علم میں جب بھی کوئی اضافہ، ترمیم یا تبدیلی ہوتی ہے، ثقافت اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن یہ اثر پذیری ایک بالکل ہی انفعالی معاملہ نہیں ہوتی۔ یہ فی الحقیقت ایک انتخابی اور تخلیقی عمل ہے۔ کسی ثقافت سے کوئی چیز لینے سے پہلے ہم اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں اس سے کیا چیز لینی چاہیے اور کیا نہیں۔ ہم اپنی اندرونی سرگرمیوں (مثلاً معتزلہ کی عقل پرستی)، بنیادی عقائد و اقدار کے مطابق دوسری ثقافت کی چیزوں میں انتخاب کرتے ہیں۔ بعض کو قبول اور بعض کو رد کرتے ہیں۔ بیرونی ثقافت سے ہم وہی چیزیں لیتے ہیں جو ہمارے بنیادی عقائد و اقدار سے میل کھاتی ہوں۔ اور پھر ہم ان کو اپنی ثقافت میں اس طرح ضم کرتے ہیں کہ وہ ہمارے لیے اجنبی نہیں رہتیں، بلکہ ہماری ہی ثقافت کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ زندہ، آزاد اور بیدار قوموں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ ثقافت اگر پھلتی پھولتی اور آگے بڑھتی ہے تو اسی اصول کو حرزِ جان بنا کر۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں نے یونانی علوم اسی اصول کے تحت اپنائے۔ لیکن جو چیز انسانی فکر کا نتیجہ ہو وہ غلطیوں سے کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مسلم فلسفے میں کچھ ایسی چیزیں بھی در آئیں جو اسلام کی رُوح کے منافی ہیں۔ امام غزالی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تہافت الفلاسفہ" میں ایسی بیس فلسفیانہ موشگافیوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کا پرزور ابطال کیا ہے۔ بہرحال غزالی نے فلسفیوں کی تردید میں جو دلائل دیئے ہیں وہ بذاتِ خود فلسفے کی جامعیت اور منطقی صحتِ فکر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

(٦) سائنس کا چیلنج اور اسلام

آزادی بڑی نعمت ہے۔ ثقافت آزادی میں پھلتی پھولتی ہے، اس کی تخلیقی قوتیں آزادی ہی میں پروان چڑھتی ہیں اور غلامی میں ان کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ سے

جب ہم ۱۸۵۷ء کے بعد کے دورِ جدید کی طرف آتے ہیں، تو برصغیر ہند کا سیاسی نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا ہے۔ مسلمان اب یہاں حاکم نہیں، محکوم ہیں۔ وہ آزاد نہیں، انگریزوں کے غلام ہیں۔ مغربی ثقافت اپنے قدم جما رہی ہے۔ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی علوم کا چرچا ہے۔ مسلمان ان اداروں میں اپنے بچوں کو اس لیے نہیں بھیجتے کہ وہاں انجیل تو باقاعدگی سے پڑھائی جاتی ہے لیکن اسلام کی تعلیم کا کوئی اہتمام نہیں۔ وہ اسلام جو نوعِ انسانی کو تباہی سے بچانے کے لیے آیا تھا، اس حال کو پہنچ گیا کہ خود اسے تباہی سے بچایا جاتے۔ اسی فکر اور جذبے کے تحت ۱۸۶۷ء میں مسجد چھتہ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی، جس کے نصاب میں درسِ نظامی کے برعکس حدیث کی تعلیم پر زیادہ زور دیا گیا۔ اسلامی معاشرے کا استحکام مولانا محمد قاسم نانوتوی (م۔ ۱۸۸۰) کا اصل مقصود تھا۔ فرد اور معاشرے دونوں کا جو رشتہ خدا سے ہے، وہ اسے ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے تھے۔ بہرحال انگریز جو جدید علوم اپنے ساتھ لائے تھے ان کی افادیت سے بھی وہ ہرگز غافل نہیں تھے۔ ۱۸۷۴ء میں پہلی دستار بندی کی تقریب کے موقع پر جو خطبہ انہوں نے دیا، اس کے چیدہ چیدہ نکات ملاحظہ ہوں،

"اہلِ عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیمِ علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارسِ سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علومِ قدیمہ کو سلاطینِ زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ہاں علومِ نقلیہ کا تنزل ہوا کہ ایسا تنزل کبھی کسی زمانے میں نہ ہوا ہوگا۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علومِ جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا اور صرف بجانبِ علومِ نقلی اور نیز ان علوم کی طرف (فنونِ دانشمندی) جس سے استعدادِ علومِ مروّجہ اور استعدادِ علومِ جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہو، توجہ دینا ضروری سمجھا گیا۔" اسلامی علوم میں جدید علوم کا پیوند لگایا جاسکتا تھا اور یہی کرنے کا اصل کام بھی تھا، لیکن وہ یہ کام اس لیے نہ کرسکے کہ "زمانۂ واحد میں علومِ کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد رہتی ہے۔" اس مشکل کا ایک حل تھا۔ منطق، فلسفے، ہیئت، ہندسہ وغیرہ کے جو یونانی علوم قرونِ وسطیٰ میں اسلامی نصاب میں داخل ہوئے، وہ اب فرسودہ ہو چکے تھے۔ انہیں نصاب سے خارج کر کے جدید استقرائی علوم کو ان کی جگہ دی جاسکتی تھی۔ (حیرت اس بات پر ہے کہ وہ اب بھی درسِ نظامی کا جزو لاینفک ہیں) لیکن اس طرف ان کا دھیان نہیں جاسکا۔ بہرحال وقت کی ضرورت

سے وہ ضرور آگاہ تھے۔ اور اپنے طلبا کو وہ استقرائی علوم سے ہرگز بے بہرہ نہیں رکھنا چاہتے تھے جس کی واحد صورت ان کے نزدیک یہ تھی کہ دیوبند کے طلبا فارغ التحصیل ہو کر اگر "مدارسِ سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں توان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی۔"

اس خطبے سے مجموعی طور پر یہ تاثر ملتا ہے کہ دیوبند، جیسا کہ وہ تاریخ میں نظر آتا ہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خواب کی پوری تعبیر نہیں ہے۔ اگر حالات سازگار ہوتے جن کے ناسازگار ہونے میں انگریزوں کا لایا ہوا سیکولر نظام تعلیم سب سے بڑی وجہ تھا، تو وہ فرسودہ یونانی علوم کو دیوبند کے نصاب سے خارج کر کے ان کی جگہ جدید استقرائی علوم کو ضرور دیتے۔ جسے اخلاقی جرأت کہتے ہیں وہ آزادی کی پیداوار ہے، غلامی تو اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ ثقافت آزادی میں پھلتی پھولتی اور آگے بڑھتی ہے۔ غلامی میں اصل مسئلہ اس کے بقا کا ہوتا ہے، پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کا نہیں۔ اور اس مقصد کو اجتہاد نہیں، بلکہ تقلید اور صرف تقلید پورا کر سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا نانوتوی نے تقلید کی راہ اختیار کی، بغداد کے بیت الحکمت کی طرح دیوبند میں ایک دارالترجمہ قائم کر کے سائنس کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ دیوبند ہمارے دورِ غلامی کی ایک عظیم درسگاہ ہے۔ یہ دیوبند ہی ہے جس نے غلام ہندوستان میں اسلامی ثقافت کو زندہ رکھا اور اسلام کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کا کام دیا۔ سائنس کے چیلنج کو اس نے قبول ہی نہیں کیا۔ اور نہ ہی اس پر مبنی ایک نئے علم الکلام کی ضرورت اس پر ظاہر ہوئی۔

(۷) تعلیم کے مقاصد

تعلیم دوگونہ مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ ایک طرف وہ ثقافت کی حفاظت کرتی ہے، تو دوسری طرف وہ معاشرے کے بدلے ہوتے حالات سے، جو علم میں ترقی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، موافقت پیدا کرنے کے لیے اس کی تعمیرِ نو کرتی ہے۔ وہ بیک وقت روایت کی امین ہے اور معاشرتی تغیر کی بھی۔ وہ معاشرے کو استحکام بھی بخشتی ہے اور اس میں تبدیلی بھی لاتی ہے۔ وہ تقلید کو بھی اپناتی ہے اور اجتہاد سے بھی کام لیتی ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا ہدف ایک ہی ہوتا ہے اور وہ ہے معاشرے کا نمو اور اس کی بقا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ

تعلیم ایک معاشرتی ادارہ ہے اور اس کے دوگونہ مقاصد کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ معاشرتی استحکام کے لیے مدرسے کھول دیئے جائیں اور معاشرتی تغیر کے لیے کالج اور یونیورسٹیاں۔ دین کی تعلیم ایک قسم کے اداروں کے سپرد کر دی جائے اور سائنس کی تعلیم دوسرے قسم کے اداروں کے سپرد۔ ایسا کیا جائے تو معاشرے میں زبردست انتشار، خلفشار بلکہ بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ وحدتِ فکر و عمل پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور معاشرے کی عضوی وحدت ختم ہو جاتی ہے اور وہ دو متحارب گروہوں میں بٹ جاتا ہے، جیسا کہ برصغیر ہند میں ہوا۔ قرونِ وسطیٰ میں جب اسلام نے فلسفے کا چیلنج قبول کیا تو مسجدوں ہی میں مذہب اور فلسفے دونوں کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ فلسفے کی تعلیم کے لیے علیحدہ مکتب و مدرسے نہیں کھولے گئے۔ نصاب میں فلسفہ مذہب میں اس طرح ضم کر دیا گیا جیسے وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوں۔ یہ اس تالیفی نصاب ہی کا ثمر تھا کہ اس زمانے کے مسلمانوں میں گفتار و کردار کی وحدت ختم نہیں ہوئی۔ معاشرہ دو مختلف گروہوں میں نہیں بٹا اور اس کی عضوی وحدت قائم رہی۔

(۸) علی گڑھ کا ناکام تجربہ

دیوبند تقلید اور معاشرتی استحکام کا حامی تھا۔ علی گڑھ اجتہاد اور معاشرتی تغیر کا حامی ہے۔ اسے دنیائے اسلام میں جدید طرز کا پہلا دار العلم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ لارڈ لٹن نے ۱۸۷۷ء میں جب اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تو اسے مسلم ہندوستان میں معاشرتی تغیر کے دور کا آغاز قرار دیا اور اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج رکھا جو ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنا۔ سر سید احمد خان (م۔ ۱۸۹۸ء) دیوبند اور اس طرح کے دوسرے اسلامی مدارس کے نصاب سے مطمئن نہیں تھے۔ یہ نصاب فلسفے اور مذہب کا امتزاج تھا جو قرونِ وسطیٰ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ جدید اسلام کا مسئلہ فلسفہ اور مذہب کی ہم آہنگی نہیں، بلکہ سائنس اور مذہب کی ہم آہنگی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ "جو علوم ہماری قوم میں سات سو برس پہلے تعلیم میں داخل ہوئے تھے، اگر آج ہم ان ہی علوم پر قناعت کریں تو گویا ہم اپنی قوم کو حال کی ترقی سے سات سو برس پیچھے لے جائیں گے۔"

انہوں نے جدید علوم کو جو انگریز اپنے ساتھ لائے تھے، اپنی تعلیم میں شامل کرنے پر زور دیا۔ اور انگلش کالج، اُردو کالج اور عربیک کالج پر مشتمل علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے مطابق انگلش کالج میں جدید علوم انگریزی میں پڑھائے جانے تھے ——— اُردو کالج میں انہی علوم کی تدریس انگریزی کی لازمی حیثیت کے ساتھ، اُردو میں ہونی تھی عربیک کالج میں مسلم ہسٹری، اسلامی ثقافت اور مسلم فلسفے پر تحقیق ہونی تھی۔ اس کے ہدف کے متعلق انہوں نے سوچا تھا کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔" اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ حکومتِ ہند کو یہ منصوبہ پسند نہیں آیا۔ وہ "تقلیدِ فرنگی" کی تو سرپرستی کر سکتی تھی، اسلامی ثقافت میں جدیدیت کی رُوح پھونکنے کی نہیں۔ سرسید کو اپنے اصل منصوبے کے دو تہائی حصّے کو خیر باد کہنا پڑا اور صرف انگلش کالج پر قناعت کرنی پڑی۔ البتہ مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے سو نمبر کی اسلامیات اس میں لازمی قرار دی گئی۔ لیکن اس کا نصاب اتنا ہلکا اور واجبی تھا کہ جدید علوم کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی قومی ضرورت کو وہ ہرگز نہیں پورا کر سکتا تھا۔ بُرا ہو غلامی کا۔ مولانا نانوتوی اور سرسید دونوں کے خواب ادھورے رہے۔ دونوں کو اپنے اپنے تعلیمی منصوبوں میں کتر بیونت کرنا پڑی۔ حاکم قوم کی تہذیب محکوم قوم کا مذہب ہوتی ہے۔ علی گڑھ اس کہاوت کا عملی نمونہ بن گیا۔ نتیجۃً "دین و مذہب کی"، بقول محترم ڈاکٹر اسرار احمد، "جان نکل کر رہ گئی اور مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے تحت مذہب کا ایک کم و بیش لامذہبی ایڈیشن تیار ہوا جس کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو صرف یہ کہ بہت سے ایسے لوگوں کو جو ذہن و فکر کے اعتبار سے ہی نہیں، تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بھی خالص یورپین بن چکے تھے، اپنے اُوپر سے اسلام کا لیبل اتارنے کی ضرورت نہ پڑی اور مسلم قومیت کے حلقے میں شامل رہ گئے اور دین کا یہ جدید ایڈیشن ان کی جانب سے مغرب کی خدمت میں بطورِ معذرت پیش کیا گیا۔" دیو بند کتنا ہی کم نظر سہی لیکن اسلام کا قلعہ بننا اسی کی قسمت میں لکھا تھا۔ اس کے برعکس علی گڑھ کی وسیع النظری اسلام کو لے ڈوبی۔ البتہ مسلم قومیت کے جذبے کو فروغ دے کر مطالبۂ پاکستان کی راہ اسی نے ہموار کی۔ تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے اسی نے ہم کنار کیا۔ جو خواب دیو بند غلام ہندوستان میں پورا نہ کر سکا، محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اسے

آزاد پاکستان میں پُورا کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کا قرآن کالج فی الوقت توطفولیت کے دور سے گزر رہا ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ میں سے اکثر لوگ اس کی جوانی بھی دیکھیں گے اور اقبال کا یہ شعر گنگنائیں گے ۔

وہ علم کم بصری جس میں ہم کنار نہیں تجلّیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

علی گڑھ کا قصور یہ نہیں ہے کہ اس نے مسلمانوں کی مادی فلاح کی طرف توجہ کیوں دی؟ معاشی مسئلے کو حل کرنا بھی بلا شک وشبہ تعلیم کا ایک مقصد ہے۔ اس کا اصل قصور یہ ہے کہ وہ فلسفے و سائنس کے عقلی علوم کی تعلیم پر اسلام کے نقلی علوم کی بالادستی قائم نہ رکھ سکا۔ وہ "مشاہداتِ حکیم" کو "تجلیاتِ کلیم" سے ہم کنار نہ کر سکا۔ وہ دنیاوی علوم کو دینی علوم سے مرلوط نہ کر سکا۔ وہ دین کی مدد سے دنیا میں حصہ لینا نہ سکھا سکا۔ وہ فلسفہ اور سائنس دونوں پر اسلام کی چھاپ نہ ڈال سکا۔ اور چھاپ ڈالتا بھی تو کیسے؟ دیوبند نے فلسفے پر مبنی علمِ کلام کی سائنس کی بنیاد پر تعمیر نو کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سر سیّد نے اس ضرورت کو شدّت سے محسوس کیا۔ انہوں نے ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی اور فطرت سے مطابقت اور عقل سے ہم آہنگی کو اس کا اصل اصول قرار دیا —— سچّا دین نہ عقل کے خلاف ہو سکتا ہے اور نہ ہی فطرت کے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور فطرت خدا کا کام —— ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد نہیں —— یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ یہاں تک تو بات بالکل صحیح ہے — چاہیے تو یہ تھا کہ سر سیّد قرآن کی روشنی میں آفاق (فطرت) میں خدا کی نشانیاں تلاش کرتے، لیکن ہُوا یوں کہ انہوں نے سائنس کی روشنی میں اللہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی اور جنّوں، فرشتوں اور معجزوں کے وجود سے انکار کر بیٹھے۔ اگر پانی برسا ہے، تو زمین ضرور گیلی ہو گی۔ لیکن اگر زمین گیلی ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ پانی ضرور برسا ہو گا۔ سر سید نے یہی غلطی کی —— اس کا لازمی اثر وحی کی بجائے سائنس پر پختہ ایمان کی صُورت میں ظاہر ہوا اور نتیجۃً علی گڑھ مغرب کی کورانہ تقلید کا مرکز بن گیا اور وہ معاشرتی تغیّر آ کے رہا، جس کی پیش گوئی لارڈ لٹن نے علی گڑھ کالج کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے ۱۸۷۷ء میں کی تھی۔

(۹) میراثِ تاریخ

برِصغیر ہند میں جب انگریزوں نے اپنے قدم جمائے اور ان کی ثقافت سے ہمارا واسطہ پڑا، تو ہم نے جدید علوم کا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے اسی طرح خیر مقدم نہیں کیا جس طرح عباسی دور میں ہم نے من حیث القوم یونانی فلسفے منطق، ریاضی، ہیئت وغیرہ کا کیا تھا ــــــ اُس وقت ہم اندرونی فعالیت سے بھرپُور ایک آزاد قوم تھے۔ ہم نے فلسفہ و مذہب کے امتزاج سے ایک مربُوط، منظم اور جامع نصاب تیار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسجدیں عقلی و نقلی دونوں علوم کا مرکز بن گیئں۔ قرونِ وسطیٰ کا یہ نصاب آج بھی پاکستان میں درسِ نظامی کی شکل میں رائج ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ سائنس کے نئے چیلنج کا جواب دینے کے لیے درسِ نظامی سے بوسیدہ یونانی علوم اور فرسُودہ علمِ کلام خارج کر کے اُن کی جگہ جدید استقرائی علوم کو دی جاتی اور ایک نئے علمِ کلام کی تشکیل کی جاتی اور انگریزی کو لازمی حیثیت دی جاتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید آج پُورے ملک میں ایک وحدانی نظامِ تعلیم رائج ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوسکا، کیونکہ اب ہم آزاد نہیں، انگریزوں کے غلام تھے اور غلامی میں قوم کی اندرونی فعالیت تقلید اور اجتہاد کے دو الگ الگ خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ دیوبند نے تقلید کا راستہ اختیار کیا اور اس کی پیروی میں نئے مکتب، مدرسے اور دار العلوم کھلتے گئے۔ علی گڑھ نے اجتہاد کا راستہ اختیار کیا اور اس کی پیروی میں اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا ــــــ ان دو متوازی تعلیمی نظاموں کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ ہم وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار سے محروم ہو گئے ــــــ ہماری قومی وحدت کا شیرازہ بکھر گیا اور ہم "مسٹر" اور "مولانا" کے دو متحارب گروہوں میں بٹ گئے جس کا خمیازہ آج پُوری قوم بھگت رہی ہے۔

(۱۰) اسلام کا نظریۂ علم

ثقافت علم کا ثمر ہے ــــــ علم میں جب بھی کوئی اضافہ، ترمیم یا تبدیلی ہوتی ہے ثقافت اِس سے ضرور متاثر ہوتی ہے، کیونکہ یہ علم ہی کی خانہ زاد ہے۔ اسلام نے پہلی مرتبہ ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف دلائی اور علم کی تحصیل اور اس کی تبلیغ مسلمانوں پر فرض کر دی۔ ضروری معلوم ہوتا

ہے کہ یہاں پر اسلامی علمیات پر بھی کچھ بات ہو جائے تاکہ ثقافت کی تشکیل اور اس کی تعمیرِ نو میں علم کا کردار واضح ہو جائے۔ علمیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو علم کے ذرائع، اس کی نوعیت، اس کی حدود اور اس کی صحت سے بحث کرتی ہے۔ اسلام کی رُو سے علم کا اصل سرچشمہ، خواہ اس کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے، خدا کی ذات ہے۔ حیوان فطری زندگی بسر کرنے کے پورے ساز و سامان سے لیس ہو کر دنیا میں آتے ہیں۔ مثلاً مرغی کا بچّہ انڈے سے نکلتے ہی دانہ چگنا شروع کر دیتا ہے۔ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت نے انہیں سینگ، پنجے، کھر، بھاگنے کی طاقت، پر وغیرہ دیئے ہیں لیکن انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اسے سب کچھ دنیا میں آکر سیکھنا پڑتا ہے۔ کیا اس اجنبی، غیر مانوس اور خطرات سے بھر پُور دنیا میں انسان کو نہتّہ بھیج دیا گیا ہے؟ اپنے تحفظ کے لیے قدرت نے انسان کو کوئی جسمانی ہتھیار تو نہیں دیا لیکن ایک ذہنی ہتھیار سے اُسے ضُرور مسلّح کیا ہے اور یہ ہتھیار ہے علم ـــــ قرآن کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت آدمؑ کو (دنیا کی) جملہ اشیاء کے نام سکھائے منطق کی رُو سے اسمائے خاص مثلاً لاہور، احمد وغیرہ کا کوئی تضمن نہیں ہوتا۔ یہ نام کسی خصوصیّت کی بنا پر نہیں رکھے جاتے۔ ان میں صرف دلالتِ افرادی پائی جاتی ہے لیکن عام اشیاء کے نام تضمنی ہوتے ہیں۔ یہ ان کے خواص کی بنا پر رکھے جاتے ہیں ـــــ مثلاً انسان کو انسان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حیوان عاقل ہے۔ یہ خصوصیت اس میں نہ پائی جائے تو اسے انسان نہیں کہیں گے ـــــ پس حضرت آدمؑ کو اشیاء کے نام سکھانے سے مراد اُن کے خواص کا علم دینا ہے، کیونکہ اس علم کے بغیر انسان کا دنیا میں زندہ رہنا ہی مشکل ہے ـــــ یہ علم ہی ہے جو جہد فی البقا میں ہمیشہ اس کے کام آتا ہے۔ علم اس کے لیے سامانِ حفظِ زندگی ہے۔ یہ علم حضرت آدمؑ کو اس لیے دیا گیا کہ جس اجنبی اور نامہربان دنیا میں انہیں بھیجا گیا، وہاں انہیں واقعتاً اس علم کی ضرورت تھی۔ فرشتوں کو یہ علم نہیں دیا گیا، کیونکہ جنت میں انہیں اس کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لی جائے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم کو فرداً فرداً دنیا کی ہر شئے کی خاصیت نہیں بتائی، بلکہ انہیں عقل استقرائی عطا فرمائی۔ جس نے چشم زدن میں دنیا کی جملہ اشیاء کے خواص ان پر ظاہر کر دیئے۔ اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی، وہ عقل ہے۔ اس حدیث سے میرے بیان کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ سلسلۂ تخلیق میں عقل چونکہ خدا سے سب سے زیادہ قریب ہے،

اس لیے جو شخص خدا کے قریب آنے کا خواہشمند ہوائسے چاہیے کہ وہ عقلِ سلیم سے اپنا رشتہ جوڑے۔ قرآن نے صراحتاً "آفاق" میں اللہ کی نشانیاں دکھانے کا وعدہ کیا ہے۔ فطرت کا علم خدا کی صنّاعی کا علم ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے انسان کی فکری اور استقرائی صلاحیتوں کو بیدار کیا۔ اسلام کا ظہور، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے، عقلِ استقرائی کا ظہور ہے۔ سائنس اسلام کے نظامِ فکر کا جزوِ لاینفک ہے۔

قرآن سائنس یا فلسفے کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن اس نے عقل، فکر، مشاہدے اور تجربے پر زور دے کر ان کے ذرائع علم ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ قوتِ سمع و بصر کا اس نے خاص طور پر بار بار ذکر کیا ہے اور گلہ بھی کیا ہے کہ تم ان نعمتوں کا شکر کیوں نہیں ادا کرتے۔ یہی تو وہ دو بڑے قویٰ ہیں جو تسخیرِ کائنات میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اپنے ماحول پر انسان کو قدرت و اختیار عطا کرتے ہیں لیکن قرآن نے جہاں کہیں قوّتِ سمع و بصر کا ذکر کیا ہے، ساتھ ہی فؤاد (وجدان) کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے آفاق کے بیرونی تجربے اور انفس کے اندرونی تجربے، دونوں کو ذریعۂ علم قرار دیا ہے اور ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا ہے، کیونکہ دونوں مل کر ہی حقیقت کا کلی علم دیتے ہیں۔ علیٰحدہ علیٰحدہ جو جزوی علم ان سے حاصل ہوتا ہے وہ ادُھورا اور نامکمل ہوتا ہے۔ خبر بغیر نظر کے، بصارت بغیر بصیرت کے اور مشاہدہ بغیر مراقبے کے علم کی اس منزل پر نہیں پہنچا سکتا جو اسلام کا اصل مقصود ہے۔ اسلام، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، اعتدال و توازن کا دین ہے۔ انتہا پسندی اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ نری عقلیت کا حامی ہے اور نہ ہی نری تجربیت کا۔ وہ نہ صرف وجدان کو ذریعہ علم سمجھتا ہے اور نہ ہی صرف وحی کو۔ اس کی علمیات ان چاروں ذرائع علم کا مجموعہ ہے۔ عقل، حسی تجربہ اور وجدان میں آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ کیونکہ ان کے سوتے انسان کی اپنی ذات سے پھوٹتے ہیں۔ رہ گئی وحی، سو وہ ان تینوں ذرائع علم پر فوقیت رکھتی ہے کیونکہ یہ انسان کو اس کی اپنی ذات کا علم دیتی ہے، آخرت کی بات کرتی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا علم دیتی ہے اور عقل، تجربے اور وجدان سے حاصل شدہ علم ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے نہ صرف زندگی کی حفاظت اور اس کی بقا کا سامان کرے، بلکہ اسے خوب سے خوب تر بنانے میں ہمہ تن و ہمہ وقت مصروف رہے۔

(۱۱) بے خدا تصوّرِ علم

مذہب کا تصورِ علم خدا کی معرفت پر مبنی تصورِ علم ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ یہ باخدا تصوّرِ علم بے خدا تصوّرِ علم میں کیسے تحویل ہو گیا؟ اس کا جواب ہے، اہل کلیسا کی سائنس دشمنی کی وجہ سے، عیسائیت کے سائنس سے براہِ راست تصادم کی وجہ سے جس کا سلسلہ کوپرنیکس (م۔ ۱۶۳۰ء) اور نیوٹن (م۔ ۱۷۲۷ء) کی سائنسی تحقیقات سے شروع ہوا۔ کوپرنیکس اور گلیلیو نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں کہا کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے۔ کلیسا نے کہا کہ یہ باتیں عیسائیت کے خلاف ہیں اور ان کے ماننے والے کافر ہیں۔ اس کے دو مہلک نتائج برآمد ہوئے۔ ایک یہ کہ سائنس اور عیسائیت میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی جس کی تفصیل ڈریپر کی کتاب "مذہب اور سائنس میں تصادم" اور واہٹ کی کتاب "سائنس اور دینیات میں تصادم کی تاریخ" میں پڑھی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فلاسفہ اور سائنس دانوں نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا اور اس طرح یورپ لادینیت کی لپیٹ میں آ گیا۔ سیاست مذہب سے علیحدہ ہو گئی۔ ریاست کا چرچ سے رشتہ منقطع ہو گیا اور مذہب ایک ذاتی معاملہ ہو کر رہ گیا۔ یہی بے دین سیاست اور بے خدا سائنس لے کر انگریز برصغیر میں آئے۔ علی گڑھ نے بے خدا تصورِ علم کو باخدا بنانے کے لیے سو نمبر کی اسلامیات لازمی کر کے مذہب ناآشنا مغربی سائنس کو اپنے نصاب میں جگہ دی لیکن بوجوہ نتیجہ وہ نہ نکل سکا جس کی اس کو توقع تھی کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو گا، سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔ اس نے سائنس کا خیر مقدم تو کیا، لیکن اسلامی مرکزِ ثقل سے دُور ہٹ کر۔ دیوبند اسلامی مرکزِ ثقل سے "وفاداری بشرطِ استواری" کے جذبے کے ساتھ چمٹا رہا اور اس جوش میں سائنس کا اسے ہوش نہ رہا۔ مغربی سائنس مذہب سے ناآشنا سہی، لیکن اسلام تو اسے بتا سکتا ہے کہ مقامِ کبریا کیا ہے؟ یہی بات بتانے کے لیے آج ہم دعوت رجوع الی القرآن لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تعلّم و تعلیم قرآن کی تحریک جوش و ہوش کا سنگم ہے۔ اس دورِ فتن میں اگر کوئی نقطہ نظر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کر سکتا ہے تو یہی تالیفی نقطہ نظر

(باقی صـ۶۴ پر)